

تفہیم القرآن

سبا

(۳)

پھر جب سلیمان پریم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز اُس گھن کے سوانہ تھی جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ اس طرح جب سلیمان گھر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ ہوتے۔

۳۱۱۔ اصل الفاظ ہیں تَبَيَّنَتْ الْحَقُّ۔ اس فقرے کا ایک ترجمہ تو وہ ہے جو ہم نے اوپر متن میں کیا ہے۔ اور دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنوں کا حال کھل گیا یا منکشف ہو گیا۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ خود جنوں کو پتہ چل گیا کہ غیب دانی کے متعلق ان کا زعم غلط ہے۔ دوسری صورت میں معنی یہ ہونگے کہ عام لوگ جو جنوں کو غیب داں سمجھتے تھے ان پر براہِ راز فاش ہو گیا کہ وہ کوئی علم غیب نہیں رکھتے۔

۳۱۲۔ موجودہ زمانے کے بعض مفسرین نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ حضرت سلیمان کا بیٹا رُحْبَام چونکہ مالِ اقی اور عیش پسند تھا اور خوشامدی مصاحبوں میں گھرا ہوا تھا، اس لیے اپنے حیلِ انفراد کی وفات کے بعد وہ اُس بارِ عظیم کو نہ سنبھال سکا جو اس پر آ پڑا تھا۔ اس کی جانشینی کے ٹھوڑی مدت بعد ہی سلطنت کا قصر و ڈھرام سے زمین پر آ رہا اور گرد و پیش کے جن سرحدی قبائل (یعنی جنوں) کو حضرت سلیمان نے اپنی قوتِ قاہرہ سے خادم بنا رکھا تھا وہ سب قابو سے نکل گئے۔ لیکن یہ تاویل کسی طرح بھی قرآن کے الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ قرآن کے الفاظ جو نقشہ ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان پر ایسی حالت میں موت طاری ہوئی جبکہ وہ ایک عصا کے

سہارے کھڑے یا بیٹھے تھے۔ اس عصا کی وجہ سے ان کا بے جان جسم اپنی جگہ قائم رہا اور جن یہ سمجھتے ہوئے ان کی خدمت میں لگے رہے کہ وہ زندہ ہیں۔ آخر کار جب عصا کو گھٹن لگ گیا اور وہ اندر سے کھوکھلا ہو گیا تو اُن کا جسم زمین پر گر گیا اور اس وقت جنوں کو تپہ چلا کہ اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس صحت اور صریح بیان واقعہ کو آخر یہ معنی پہنچانے کی کیا معقول وجہ ہے کہ گھٹن سے مراد حضرت سلیمان کے بیٹے کی نالائقی ہے، اور عصا سے مراد اُن کا اقتدار ہے، اور ان کے مردہ جسم کے گر جانے سے مراد ان کی سلطنت کا پارہ پارہ ہو جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اگر یہی مضمون بیان کرنا ہوتا تو کیا اس کے لیے عربی میں الفاظ موجود نہ تھے کہ اس ہیر پھیر کے ساتھ اسے بیان کیا جاتا؟ یہ پسیلیوں کی زبان آخر قرآن مجید میں کہاں استعمال کی گئی ہے؟ اور اُس زمانے کے عام عرب جو اس کلام کے اولین مخاطب تھے یہ پہلی کیسے بوجھ سکتے تھے؟

پھر اس تاویل کا سب سے زیادہ عجیب حصہ یہ ہے کہ اس میں جنوں سے مراد وہ سرحدی قبائل ہیں جو آج کے میں جنہیں حضرت سلیمان نے اپنی خدمت میں لگا رکھا تھا۔ سوال یہ ہے کہ آخر ان قبائل میں سے کون غیب دانی کا مدعی تھا اور کس کو مشرکین غیب داں سمجھتے تھے؟ آیت کے آخری الفاظ کو اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر پڑھے تو وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جن سے مراد یہاں لازماً کوئی ایسا گروہ ہے جو یا تو خود غیب دانی کا دعویٰ رکھتا تھا، یا لوگ اس کو غیب داں سمجھتے تھے، اور اس گروہ کے غیب سے ناواقف ہونے کا راز اس واقعہ نے فاش کر دیا کہ وہ حضرت سلیمان کو زندہ سمجھتے ہوئے خدمت میں لگے رہے، حالانکہ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ قرآن مجید کا یہ بیان اس کے لیے کافی تھا کہ ایک ایمان دار آدمی اس کو دیکھ کر اپنے اس خیال پر نظر ثانی کر لیتا کہ جن سے مراد سرحدی قبائل ہیں۔ لیکن جو لوگ مادہ پرست دنیا کے سامنے جن نامی ایک پوشیدہ مخلوق کا وجود تسلیم کرتے ہوئے شرماتے ہیں وہ قرآن کی اس تصریح کے باوجود اپنی تاویل پر مصر ہیں۔

قرآن میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ مشرکین عرب جنوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتے تھے، انہیں اللہ کی اولاد سمجھتے تھے اور ان سے پناہ مانگا کرتے تھے:

سبا کے لیے ان کے اپنے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی، دو باغ دائیں اور

وَجَعَلْنَا لِلَّهِ شُرَكَاءَ الْجَنَّاتِ وَخَلَقْنَا

اور انہوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرایا، حالانکہ

(الانعام - ۱۰۰)

اس نے ان کو پیدا کیا ہے۔

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ

اور انہوں نے اللہ کے اور جنوں کے درمیان

نَسَبًا (الصافات - ۱۵۸)

نسبی تعلق تجویز کر لیا۔

وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ

اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے

يَعُودُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجَنَّةِ (الجن - ۱۶)

کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے۔

انہی عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ وہ جنوں کو عالم الغیب سمجھتے تھے اور غیب کی

باتیں جاننے کے لیے اُن کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ یہاں اسی عقیدے کی تردید کے لیے

یہ واقعہ سنارہا ہے اور اس سے مقصود کفار عرب کو یہ احساس دلانا ہے کہ تم لوگ خواہ مخواہ جاہلیت

کے غلط عقائد پر اصرار کیسے چلے جا رہے ہو حالانکہ تمہارے یہ عقائد بالکل بے بنیاد ہیں۔

۵۷ سلسلہ بیان کو سمجھنے کے لیے رکوع اول کے مضمون کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے اُس

میں یہ بتایا گیا ہے کہ کفار عرب آخرت کی آمد کو بعید از عقل سمجھتے تھے اور جو رسول اس عقیدے کو پیش

کر رہا تھا اس کے متعلق کھلم کھلا یہ کہہ رہے تھے کہ ایسی عجیب باتیں کرنے والا آدمی یا تو مجنون ہو سکتا

ہے، یا پھر وہ جان بوجھ کر اقترا پر دازی کر رہا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے پہلے جید عقلی

دلائل ارشاد فرماتے جن کی تشریح ہم حواشی نمبر ۸، ۱۰ اور ۱۲ میں کر چکے ہیں۔ اس کے بعد رکوع دوم میں صحت

دراؤد و سیماں کا قصہ اور پھر سبا کا قصہ ایک تاریخی دلیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے جس سے مقصود حقیقت

ذہن نشین کرنا ہے کہ روستے زمین پر خود نوع انسانی کی اپنی سرگزشت قانون مکافات کی شہادت

دے رہی ہے۔ انسان اپنی تاریخ کو غور سے دیکھے تو اسے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ دنیا کوئی اندھیر

نگری نہیں ہے جس کا سارا کارخانہ اندھا دھند چل رہا ہو بلکہ اس پر ایک سمیع و بصیر خدا فرما نروائی

کر رہا ہے جو شکر کی راہ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ایک معاملہ کرتا ہے اور ناشکری و کافر نعمتی

بائیں ۵۱؎ کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور شکریہ بجالاؤ اُس کا، ملک سے عمدہ و پاکیزہ اور پروردگار سے بخشش فرمانے والا۔ مگر وہ منہ موڑ گئے۔ آخر کار ہم نے اُن پر بند فوڑ سیلاب بھیج دیا اور ان کے پچھلے دو باغوں کی جگہ دو اور باغ انہیں دیتے جن میں کڑوے کیسے پھل اور جھاڑ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی سیریاں ۵۲؎ یہ تھا ان کے کفر کا بدلہ جو ہم نے ان کو دیا، اور ناشکرے انسان کے سوا ایسا بدلہ ہم اور کسی کو نہیں دیتے۔

کی راہ چلنے والوں کے ساتھ بالکل ہی ایک دوسرا معاملہ فرماتا ہے۔ کوئی سبق لینا چاہے تو اسی تاریخ سے یہ سبق لے سکتا ہے کہ جس خدا کی سلطنت کا یہ مزاج ہے اس کی خدائی میں نیکی اور بدی کا انجام کبھی یکساں نہیں ہو سکتا۔ اس کے عدل و انصاف کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک وقت ایسا آئے جب نیکی کا پورا اجر اور بدی کا پورا بدلہ دیا جائے

۵۳؎ یعنی اس امر کی نشانی کہ جو کچھ ان کو میسر ہے وہ کسی کا عطیہ ہے نہ کہ ان کا اپنا آفریدہ اور اس امر کی نشانی کہ ان کی بندگی و عبادت اور شکریہ و سپاس کا مستحق وہ خدا ہے جس نے ان کو یہ نعمتیں دی ہیں نہ کہ وہ جن کا کوئی حصہ ان نعمتوں کی بخشش میں نہیں ہے۔ اور اس امر کی نشانی کہ ان کی دولت لازم و ملزوم نہیں ہے بلکہ جس طرح آئی ہے اُسی طرح جا بھی سکتی ہے۔

۵۴؎ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پورے ملک میں بس دو ہی باغ تھے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ سب کی پوری سرزمین گلزار بنی ہوئی تھی۔ آدمی جہاں بھی کھڑا ہوتا اسے اپنے دائیں جانب بھی باغ نظر آتا اور بائیں جانب بھی۔

۵۵؎ یعنی بندگی و شکریہ گزاری کے بجائے انہوں نے نافرمانی و ملک حرامی کی روش اختیار کر لی۔ ۵۶؎ اصل میں لفظ سَبَّأُ الْعَرَبُ استعمال کیا گیا ہے۔ عَرَبِ جنوبی عرب کی زبان کے لفظ عَرَبِ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ”بند“ کے ہیں یمن کے کھنڈروں میں جو قدیم کتابت موجودہ زمانے میں دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں یہ لفظ اس معنی میں بکثرت استعمال ہوا ہے مثلاً ۵۷؎ یا ۵۸؎ کا ایک کتبہ جو یمن کے حبشی گورنر ابرہہ نے مدینہ منورہ کی مرمت کرانے کے بعد نصب

اور ہم نے اُن کے اور اُن بستیوں کے درمیان، جن کو ہم نے برکت عطا کی تھی، نمایاں بستیاں بسا دی تھیں اور اُن میں سفر کی مسافتیں ایک اندازے پر رکھ دی تھیں۔ چلو پھرو ان راستوں میں رات دن پورے امن کے ساتھ۔ مگر انہوں نے کہا: ”اے ہمارے رب ہمارے سفر دور دراز کے کر دو“۔ انہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا۔ آخر کار ہم نے کرایا تھا اس میں وہ اس لفظ کو بار بار بند کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ لہذا سبل العرم سے مراد وہ سیلاب ہے جو کسی بند کے ٹوٹنے سے آئے۔

۳۲ یعنی سبل العرم کے آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا علاقہ برباد ہو گیا۔ سبا کے لوگوں نے پہاڑوں کے درمیان بند باندھ باندھ کر جو نہریں جاری کی تھیں وہ سب ختم ہو گئیں اور آب پاشی کا پورا نظام درہم برہم ہو گیا۔ اس کے بعد وہی علاقہ جو کبھی حنت نظیر بنا ہوا تھا خود دروخت کی دھنوں سے بھر گیا اور اس میں کھانے کے قابل اگر کوئی چیز باقی رہ گئی تو وہ محض جھاڑی بوٹی کے بیر تھے۔

۳۳ ”برکت والی بستیوں“ سے مراد شام و فلسطین کا علاقہ ہے جسے قرآن مجید میں عموماً اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے دمشق کے طور پر ملاحظہ ہو الاعراف، مائت ۱۳۷- بنی اسرائیل آیت الانبیاء، آیات ۷۱ و ۸۱۔

”نمایاں بستیوں“ سے مراد ہیں ایسی بستیاں جو شاہراہ عام پر واقع ہوں، گوشوں میں چھپی ہوئی نہ ہوں۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بستیاں بہت زیادہ قاصدے پر نہ تھیں بلکہ متصل تھیں۔ ایک بستی کے آثار ختم ہونے کے بعد دوسری بستی کے آثار نظر آنے لگتے تھے۔

سفر کی مسافتوں کو ایک اندازے پر رکھنے سے مراد یہ ہے کہ مین سے شام تک کا پورا سفر مسلسل آباد علاقے میں طے ہوتا تھا جس کی ہر منزل سے دوسری منزل تک کی مسافت معلوم و متعین تھی۔ آباد علاقوں کے سفر اور غیر آباد صحرائی علاقوں کے سفر میں یہی فرق ہوتا ہے۔ صحراء میں مسافر جب تک چاہتا ہے چلتا ہے اور جب تھک جاتا ہے تو کسی جگہ ٹپاؤ کرتا ہے۔ بخلاف اس کے آباد علاقوں میں راستے کی ایک بستی سے دوسری بستی تک کی مسافت جانی بوجھی اور متعین ہوتی ہے۔

انہیں افسانہ بنا کر رکھ دیا اور انہیں بالکل ترشہ ترشہ کر ڈالا۔ یسینا اس میں نشانیاں ہیں بس اس شخص کے لیے جو بڑا صابر و شاکر ہو۔ اُن کے معاملہ میں ابلیس نے اپنا گمان صحیح پایا اور انہوں نے اُسی کی پیروی کی، بجز ایک تھوڑے سے گروہ کے جو مومن تھے۔ ابلیس کو مسافر ہی سے پروگرام بنا سکتا ہے کہ راستے کے کن کن مقامات پر وہ ٹھہرنا ہوا جائے گا، کہاں دوپہر گزارے گا اور کہاں رات بسر کرے گا۔

۳۲ ضروری نہیں ہے کہ انہوں نے زبان ہی سے یہ دعا کی ہو۔ دراصل جو شخص بھی خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے وہ گویا زبان حال سے یہ کہتا ہے کہ خدایا میں ان نعمتوں کا مستحق نہیں ہوں۔ اور اسی طرح جو قوم اللہ کے فضل سے غلط فائدہ اٹھاتی ہے وہ گویا اپنے رب سے یہ دعا کرتی ہے کہ اے پروردگار یہ نعمتیں ہم سے سلب کرے کیونکہ ہم ان کے قابل نہیں ہیں۔

علاوہ بریں رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا خدایا ہمارے سفر و دور دراز کر دے، کے الفاظ سے کچھ یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ شاید سبا کی قوم کو اپنی آبادی کی کثرت کھٹنے لگی تھی اور دوسری نادان قوموں کی طرح اس نے بھی اپنی برحق بیوٹی آبادی کو خطرہ سمجھ کر انسانی پیداوار روکنے کی کوشش کی تھی۔

۳۳ یعنی سبا کی قوم ایسی منتشر ہوئی کہ اس کی پراگندگی ضرب المثل ہو گئی۔ آج بھی اہل عرب اگر کسی گروہ کے انتشار کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تَفَرَّقُوا ایدی سبا! وہ تو ایسے پراگندہ ہو گئے جیسے سبا کی قوم پراگندہ ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب زوالِ نعمت کا دور شروع ہوا تو سبا کے مختلف قبیلے اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر عرب کے مختلف علاقوں میں چلے گئے غنائیوں نے اُردن اور شام کا رخ کیا۔ اوس و خزرج کے قبیلے شرب میں چلے۔ خزاعہ نے جدے کے قریب تہامند کے علاقہ میں سکونت اختیار کی۔ ازد کا قبیلہ عمان میں جا کر آباد ہوا۔ نخع اور جذام اور کندہ بھی بکھلنے پر مجبور ہوئے۔ حتیٰ کہ سبا نام کی کوئی قوم ہی دنیا میں باقی نہ رہی۔ صرف اس کا ذکر افسانوں میں رہ گیا۔

۳۴ اس سیاق و سباق میں صابر و شاکر سے مراد یہ شخص یا گروہ ہے جو اللہ کی طرف سے

اُن پر کوئی اقتدار حاصل نہ تھا مگر جو کچھ ہوا وہ اس لیے ہوا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون آخرت کا ماننے والا ہے اور کون اس کی طرف سے شک میں پڑا ہوا ہے۔ تیرا

نعتیں پا کر آپ سے باہر نہ ہر جاتے، نہ خوشحالی پر پھولے اور نہ اُس خدا کو بھول جاتے جس نے یہ سب کچھ اسے عطا کیا ہے۔ ایسا انسان اُن لوگوں کے حالات سے بہت کچھ سبق لے سکتا ہے جنہوں نے عروج و زرقی کے مواقع پا کر نافرمانی کی روش اختیار کی اور اپنے انجام بد سے دو چار ہو کر رہے۔
۵۳ تاریخ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قدیم زمانے سے قوم سبا میں ایک عنصر ایسا موجود تھا جو دوسرے معبودوں کو ماننے کے بجائے خدا سے واحد کو مانتا تھا۔ موجودہ زمانے کی اثری تحقیقات کے سلسلے میں یمن کے کھنڈروں سے جو کتبات ملے ہیں ان میں سے بعض اس قلیل عنصر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ۵۴ ق م کے لگ بھگ زمانے کے بعض کتبات بتاتے ہیں کہ مملکت سبا کے متعدد مقامات پر ایسی عبادت گاہیں بنی ہوئی تھیں جو دسموی یا ذوسماوی (یعنی رب السماء) کی عبادت کے لیے مخصوص تھیں۔ بعض مقامات پر اس معبود کا نام ملکن دسموی (وہ بادشاہ جو آسمانوں کا مالک ہے) لکھا گیا ہے۔ یہ عنصر مسلسل صدیوں تک یمن میں موجود رہا۔ چنانچہ ۵۵ کے ایک کتبے میں بھی اللہ ذوسموی کے نام سے ایک عبادت گاہ کی تعمیر کا ذکر ملتا ہے۔ پھر ۵۶ کے ایک کتبے میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں: بنصر وردا الحن بعل سمین وارضین (یعنی اس خدا کی مدد و تائید سے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے) اسی زمانہ کے ایک اور کتبے میں جس کی تاریخ ۵۷ ہے اسی خدا کے لیے رحمان کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اصل الفاظ ہیں بودار حمن (یعنی رحمان کی مدد سے)۔

۵۷ یعنی انہیں کو یہ طاقت حاصل نہ تھی کہ اُن کا ارادہ تو خدا کی فرمانبرداری کرنے کا ہو مگر وہ زبردستی ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں نافرمانی کی راہ پر کھینچ لے گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی قدرت اس کو دی تھی وہ صرف اس حد تک تھی کہ وہ انہیں بہکاٹے اور ایسے تمام لوگوں کو اپنے پیچھے لگائے جو خود اس کی پیروی کرنا چاہیں۔ اور اس انحراف کے مواقع ابلیس کو اس لیے عطا کیے گئے تاکہ آخرت

رب ہر چیز پر نگران ہے

کے ماننے والوں اور اس کی آمد میں شک رکھنے والوں کا فرق کھل جاتے۔

دوسرے الفاظ میں یہ ارشادِ ربانی اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ عقیدہ آخرت کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہیں ہے جو اس دنیا میں انسان کو راہِ راست پر قائم رکھنے کی ضامن ہو سکتی ہو۔ اگر کوئی شخص یہ نہ مانتا ہو کہ اسے مرکب دوبارہ اٹھنا ہے اور اپنے خدا کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے، تو وہ لازماً گمراہ و بدراہ ہو کر رہے گا، کیونکہ اس کے اندر سرے سے وہ احساسِ ذمہ داری پیدا ہی نہ ہو سکے گا جو آدمی کو راہِ راست پر ثابت قدم رکھتا ہے۔ اسی لیے شیطان کا سب سے بڑا حربہ جس سے وہ آدمی کو اپنے پھندے میں پھانتا ہے، یہ ہے کہ وہ اسے آخرت سے غافل کرتا ہے۔ اُس کے اس فریب سے جو شخص بچ نکلے وہ کبھی اس بات پر راضی نہ ہو گا کہ اپنی اصل دائمی زندگی کے مفاد کو دنیا کی اس عارضی زندگی کے مفاد پر قربان کر دے۔ بخلاف اس کے جو شخص شیطان کے دام میں آکر آخرت کا منکر ہو جاتے، یا کم از کم اُس کی طرف سے شک میں پڑ جاتے، اُسے کوئی چیز اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ جو نقد سودا اس دنیا میں ہو رہا ہے اُس سے صرف اس لیے ہاتھ اٹھ لے کہ اُس کے کسی بعد کی زندگی میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ دنیا میں جو شخص بھی گمراہ ہوا ہے اسی انکارِ آخرت یا شک فی الآخرۃ کی وجہ سے ہوا ہے، اور جس نے بھی راست روی اختیار کی ہے اس کے صحیح طریقہ عمل کی بنیاد ایمان بالآخرۃ ہی پر قائم ہوئی ہے۔

۱۱۷۷ ق م قوم سبا کی تاریخ کی طرف یہ اشارت جو قرآن مجید میں کیے گئے ہیں ان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ معلومات بھی ہماری نگاہ میں رہیں جو اس قوم کے متعلق دوسرے تاریخی ذرائع سے فراہم ہوتی ہیں۔

تاریخ کی رُو سے سبا "جنوبی عرب کی ایک بہت بڑی قوم کا نام ہے جو چند بڑے بڑے قبائل پر مشتمل تھی۔ امام احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن عبدالبر اور ترمذی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سبا عرب کے ایک شخص کا نام تھا جس کی نسل سے عرب میں حب

ذیل قبیلے پیدا ہوئے: بکندہ، حمیر، آزد، أشعرین، مذحج۔ آثار دجس کی موٹاخنیں ہیں، خشم اور بچیلہ۔
عابلہ، جذام، نخم اور غسان۔

بہت قدیم زمانے سے دنیا میں عرب کی اس قوم کا شہرہ تھا۔ سنہ ۲۵ قبل مسیح میں اور کے کنبات اس کا ذکر ساہوم کے نام سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد بابل اور آشور (اسیریا) کے کنبات میں اور اسی طرح بائبل میں بھی کثرت سے اس کا ذکر آیا ہے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو زبور، ۷۲: ۱۵)۔
یرمیاہ ۶: ۲۰۔ حزقی ایل ۲۷: ۲۲۔ ۳۸: ۱۳۔ ایوب ۶: ۱۹۔ یونان و روم کے مورخین و جغرافیہ نویس تھیو فراسٹس (سنہ ۲۸ ق م) کے وقت سے مسیح کے بعد کی کئی صدیوں تک مسلسل اس کا ذکر کرتے چلے گئے ہیں۔

اس کا وطن عرب کا جنوبی مغربی گوشہ تھا جو آج یمن کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے عروج کا دور گیارہ سو برس قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں ایک دولت مند قوم کی حیثیت سے اس کا شہرہ آفاق میں پھیل چکا تھا۔ آغاز میں یہ ایک آفتاب پرست قوم تھی۔ پھر جب اس کی ملکہ حضرت سلیمان (سنہ ۹۶۵۔ ۹۲۶ ق م) کے ہاتھ پر ایمان لے آئی تو غلبہ یہ ہے کہ اس کی غالب اکثریت مسلمان ہو گئی تھی۔ لیکن بعد میں نہ معلوم کس وقت اس کے اندر شرک و بت پرستی کا پھر زور ہو گیا اور اس نے الملقہ (چاند دیوتا)، عشتار (زہرہ)، ذات جمجم اور ذات بعدان (سورج دیوی)، ہوبیس، حرتم یا حریمیت اور ایسے ہی دوسرے بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کو پوجنا شروع کر دیا۔ الملقہ اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا تھا اور اس کے بادشاہ اپنے آپ کو اسی دیوتا کے ولیل کی حیثیت سے اطاعت کا حق دار قرار دیتے تھے۔ یمن میں بکثرت کنبات ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سارا ملک ان دیوتاؤں، اور خصوصاً الملقہ کے مندروں سے بھرا ہوا تھا اور ہر اہم واقعہ پر ان کے شکر یہ ادا کیے جاتے تھے۔

آثار قدیمہ کی جدید تحقیقات کے سلسلے میں یمن سے تقریباً ۳ ہزار کنبات فراہم ہوئے ہیں جو اس قوم کی تاریخ پر اہم روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ عربی روایات اور رومی و یونانی تواریخ کی فراہم کردہ

معلومات کو اگر جمع کر لیا جاتے تو اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ اس کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ ان معلومات کی رُو سے اس کی تاریخ کے اہم ادوار حسب ذیل ہیں:

(۱) سنہ ۶۵ ق م سے پہلے کا دور۔ اس زمانے میں ملوک سیا کا لقب مُکرب سباً تھا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ لفظ مُکرب کا ہم معنی تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بادشاہ انسانوں اور خداؤں کے درمیان اپنے آپ کو واسطہ قرار دیتے تھے، یا دوسرے الفاظ میں یہ کاہن بادشاہ (PRIEST KINGS) تھے۔ اس زمانے میں ان کا پایہ تخت صراح تھا جس کے کھنڈر آج بھی مارب سے مغرب کی جانب ایک دن کی راہ پر پائے جاتے ہیں اور خرمیہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی دور میں مارب کے مشہور بند کی بنا رکھی گئی اور وقتاً فوقتاً مختلف بادشاہوں نے اسے وسیع کیا۔

(۲) سنہ ۶۵ ق م سے سنہ ۵۵ ق م تک کا دور۔ اس دور میں سبا کے بادشاہوں نے مُکرب کا لقب چھوڑ کر ملک (بادشاہ) کا لقب اختیار کر لیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت میں مذہبیت کی جگہ سیاست اور سیکولرزم کا رنگ غالب ہو گیا۔ اس زمانے میں ملوک سبا نے صراح کو چھوڑ کر مارب کو اپنا دار السلطنت بنایا اور اسے غیر معمولی ترقی دی۔ یہ مقام سمندر سے ۳۹۰۰ فیٹ کی بلندی پر صناعاً سے ۶۰ میل جنوب مشرق واقع ہے اور آج تک اس کے کھنڈر شہادت دے رہے ہیں کہ یہ بھی ایک بڑی متقدم قوم کا مرکز تھا۔

(۳) سنہ ۵۵ ق م سے سنہ ۴۰ ق م تک کا دور۔ اس زمانے میں سبا کی مملکت پر حمیر کا قبیلہ غالب ہو گیا جو قوم سبا ہی کا ایک قبیلہ تھا اور تعداد میں دوسرے تمام قبائل سے بڑھا ہوا تھا اس دور میں مارب کو اجاڑ کر ریدان پایہ تخت بنایا گیا جو قبیلہ حمیر کا مرکز تھا۔ بعد میں یہ شہر ظفار کے نام سے موسوم ہوا۔ آج کل موجودہ شہر یریم کے قریب ایک مدور پہاڑی پر اس کے کھنڈر ملتے ہیں اور اسی کے قریب علاقہ میں ایک چھوٹا سا قبیلہ حمیر کے نام سے آباد ہے جسے دیکھ کر کوئی شخص تصور تک نہیں کر سکتا کہ یہ اسی قوم کی یادگار ہے جس کے ڈنکے کبھی دنیا بھر میں بجتے تھے۔ اسی زمانے میں سلطنت کے ایک حصہ کی حیثیت سے پہلی مرتبہ لفظ نبنت اور مینات کا لفظ استعمال ہونا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ

یمن اس پورے علاقے کا نام ہو گیا جو عرب کے جنوبی مغربی کونے پر عیسر سے عدن تک اور باب المندب سے
حضر موت تک واقع ہے یہی دور ہے جس میں سبائیوں کا زوال شروع ہوا۔

(۴) مسئلہ کے بعد سے آغاز اسلام تک کا دور یہ قوم سبا کی تباہی کا دور ہے۔ اس دور میں
ان کے ہاں مسلسل خانہ جنگیاں ہوئیں۔ بیرونی قوموں کی مداخلت شروع ہوئی۔ تجارت برباد ہوئی۔
زراعت نے دم توڑا۔ اور آخر کار آزادی تک ختم ہو گئی۔ پہلے ریدانیوں، حمیریوں، اور ہمدانیوں کی باہمی
نزاعات سے فائدہ اٹھا کر سلسلہ سے سلسلہ تک یمن پر حبشیوں کا قبضہ رہا۔ پھر آزادی تو بحال
ہو گئی مگر یارب کے مشہور بند میں رخنے پڑنے شروع ہو گئے یہاں تک کہ آخر کار سلسلہ یا سلسلہ میں
بند کے ٹوٹنے سے وہ عظیم سیلاب آیا جس کا ذکر اوپر قرآن مجید کی آیات میں کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس کے
بعد ابہر کے زمانے تک اس بند کی مسلسل مرتیں ہوتی رہیں، لیکن جو آبادی منتشر ہو چکی تھی وہ پھر جمع نہ
ہو سکی اور نہ آب پاشی اور زراعت کا وہ نظام جو دریم برہم ہو چکا تھا، دوبارہ بحال ہو سکا۔ سلسلہ
میں یمن کے یہودی بادشاہ ذونواس نے نجران کے عیسائیوں پر وہ ظلم و ستم برپا کیا جس کا ذکر
قرآن مجید میں اصحاب الاخذہ کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں حبش کی عیسائی سلطنت یمن
پر انتقاماً حملہ آور ہو گئی۔ اور اس نے سارا ملک فتح کر لیا۔ اس کے بعد یمن کے حبشی وائسرائے ابرہہ نے
کعبہ کی مرکزیت ختم کرنے اور عرب کے پورے مغربی علاقے کو رومی حبشی اثر میں لانے کے لیے سلسلہ
یا سلسلہ میں (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے چند روز قبل) مکہ معظمہ پر حملہ کیا اور اس کی پوری
فوج پر وہ تباہی آئی جسے قرآن مجید میں اصحاب الفیل کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے آخر کار سلسلہ
میں یمن پر ایرانیوں کا قبضہ ہوا اور اس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب سلسلہ میں ایرانی گورنر باذان
نے اسلام قبول کر لیا۔

قوم سبا کا عروج و راسخ دو دنیاؤں پر قائم تھا۔ ایک زراعت۔ دوسرے تجارت۔ زراعت
کو انہوں نے آب پاشی کے ایک بہترین نظام کے ذریعہ سے ترقی دی تھی جس کے مثل کوئی دوسرا
نظام آب پاشی باہر کے سوانہ نہیں دیکھتا تھا۔ (ان کی سرزمین میں قدرتی دریا نہ تھے۔

بارش کے زمانے میں پہاڑوں سے برساتی نالے بہ نکلتے تھے۔ انہی نالوں پر سارے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر انہوں نے تالاب بنالیے تھے اور ان سے نہریں نکال نکال کر پورے ملک کو اس طرح سیراب کر دیا تھا کہ قرآن مجید کی تعبیر کے مطابق ہر طرف ایک باغ ہی باغ نظر آتا تھا۔ اس نظام آب پاشی کا سب سے بڑا مخزن آب وہ تالاب تھا جو شہر مارب کے قریب کوہ بن کی درمیانی وادی پر بند باندھ کر تیار کیا گیا تھا۔ مگر جب اللہ کی نظر عنایت ان سے پھر گئی، تو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں یہ عظیم الشان بند ٹوٹ گیا اور اس سے نکلنے والا سیلاب راستے میں بند پر بند توڑنا چلا گیا یہاں تک کہ ملک کا پورا نظام آب پاشی تباہ ہو کر رہ گیا۔ پھر کوئی اسے بحال نہ کر سکا۔

تجارت کے لیے اس قوم کو خدا نے بہترین جغرافیہ مقام عطا کیا تھا جس سے اس نے خوب فائدہ اٹھایا۔ ایک ہزار برس سے زیادہ مدت تک یہی قوم مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت کا واسطہ بنی رہی۔ ایک طرف ان کے بندر گاہوں میں چین کا ریشم، انڈونیشیا اور مالابار کے گرم سلسے، ہندوستان کے کپڑے اور تلواریں، مشرقی افریقہ کے زنگی غلام، بندر، شتر مرغ کے پر اور ہاتھی دانت پہنچتے تھے اور دوسری طرف یہ ان چیزوں کو مصر اور شام کی منڈیوں میں پہنچاتے تھے جہاں سے روم و یونان تک یہ مال روانہ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خود ان کے علاقے میں لبان، عود، عنبر، مشک، مر، قرفہ، قصب الذریرہ، سیلخہ اور دوسری اُن خوشبودار چیزوں کی بڑی پیداوار تھی جنہیں مصر و شام اور روم و یونان کے لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔

اس عظیم الشان تجارت کے دو بڑے راستے تھے۔ ایک بحری۔ دوسرا بری۔ بحری تجارت کا اجارہ ہزار سال تک انہی سیانیوں کے ہاتھ میں تھا، کیونکہ کھراچہ کی موسمی ہواؤں، زیر آب چٹانوں اور لٹرا اندازی کے مقامات کا راز یہی لوگ جانتے تھے اور دوسری کوئی قوم اس خطرناک سمندر میں جہاز چلانے کی ہمت نہ رکھتی تھی۔ اس بحری راستے سے یہ لوگ اردن اور مصر کی بندرگاہوں تک اپنا مال پہنچا کرتے تھے۔ بری راستے عدن اور حضرموت سے مارب پر جا کر ملتے تھے اور پھر وہاں سے ایک شاہراہ مکہ، جدہ، یشرب، العلاء، تبوک اور ایلہ سے گزرتی ہوئی پشترانک پہنچتی تھی۔

اس کے بعد ایک راستہ مصر کی طرف اور دوسرا راستہ شام کی طرف جاتا تھا۔ اس تری راستے پر جبکہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے، یمن سے حدود شام تک سبائیوں کی نوآبادیاں مسلسل قائم تھیں اور شیبہ روز ان کے تجارتی قلعے یہاں سے گزرتے رہتے تھے۔ آج تک ان میں سے بہت سی نوآبادیوں کے آثار اس علاقے میں موجود ہیں اور وہاں سبائی و حمیری زبان کے کتبات مل رہے ہیں۔

پہلی صدی عیسوی کے لگ بھگ زمانے میں اس تجارت پر زوال آنا شروع ہو گیا۔ مشرق وسطیٰ میں جب یونانیوں اور پھر رومیوں کی طاقت و سلطنتیں قائم ہوئیں تو شور مچنا شروع ہوا کہ عرب تاجر اپنی اجارہ داری کے باعث مشرق کے اموال تجارت کی من مانی قیمتیں وصول کر رہے ہیں اور ضرورت ہے کہ ہم خود اس میدان میں آگے بڑھ کر اس تجارت پر قبضہ کریں۔ اس غرض کے لیے سب سے پہلے مصر کے یونانی الاصل فرمانروا بطلمیوس ثانی (۳۸۵ء - ۳۲۶ء ق م) نے اس قدیم نہر کو پھر سے کھولا جو ۷ سو برس پہلے فرعون سسوسٹرئس نے دریائے نیل کو بحر احمر سے ملانے کے لیے کھدوائی تھی۔ اس نہر کے ذریعہ سے مصر کا بحری بیڑا پہلی مرتبہ بحر احمر میں داخل ہوا۔ لیکن سبائیوں کے مقابلے میں یہ پیش زیادہ کارگر نہ ہو سکی۔ پھر جب مصر پر روم کا قبضہ ہوا تو رومی زیادہ طاقت ور تجارتی بیڑا بحر احمر میں لے آئے اور اس کی پشت پر انہوں نے ایک جنگی بیڑا بھی لا کر ڈال دیا۔ اس طاقت کا مقابلہ سبائیوں کے بس میں نہ تھا۔ رومیوں نے جبکہ جگہ بندرگاہوں پر اپنی تجارتی نوآبادیاں قائم کیں ان میں جہازوں کی ضروریات فراہم کرنے کا انتظام کیا، اور جہاں ممکن ہوا وہاں اپنے فوجی دستے بھی رکھ دیئے۔ حتیٰ کہ ایک وقت وہ آگیا کہ عدن پر رومیوں کا فوجی تسلط قائم ہو گیا۔ اسی سلسلے میں رومی اور ہنسی سلطنتوں نے سبائیوں کے مقابلے میں باہم ساز باز بھی کر لیا جس کی بدولت بالآخر اس قوم کی آزادی تک ختم ہو گئی۔

مصری تجارت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد صرف تری تجارت سبائیوں کے پاس رہ گئی تھی۔ مگر بہت سے اسباب نے رفتہ رفتہ اس کی نگر بھی توڑ دی۔ پہلے نبطیوں نے سبائیوں کے علاقے کو لایا۔ پھر سبائیوں نے سبائیوں کو نکال باہر کیا۔ پھر سبائیوں نے سبائیوں کی تمام نوآبادیوں سے سبائیوں کو نکال باہر کیا۔ پھر سبائیوں نے سبائیوں کی تمام نوآبادیوں سے سبائیوں کو نکال باہر کیا۔

سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور حجاز کی سرحد تک شام وارون کے تمام علاقے ان کے مضبوط ہاتھوں میں چلے گئے۔ اس کے بعد حبش اور روم کی متحدہ کوشش یہ رہی کہ سبائیوں کی باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھا کر ان کی تجارت کو بالکل تباہ کر دیا جاتے۔ اسی بنا پر حبشی بار بار یمن میں مداخلت کرتے رہے یہاں تک کہ آخر کار انہوں نے پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کے غضب نے اس قوم کو انتہائی عروج سے گرا کر اُس گڑھے میں پھینک دیا جہاں سے پھر کوئی معذوب قوم کبھی سر نہیں نکال سکی ہے۔ ایک وقت تھا کہ اس کی دولت کے افنائے سن کر یونان و روم والوں کے منہ میں پانی بھرا آتا تھا۔ اسٹرابو لکھتا ہے کہ یہ لوگ سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرتے ہیں، اور ان کے مکانات کی چھتوں، دیواروں اور دروازوں تک میں ہاتھی دانت سونے، چاندی اور جواہر کا کام بنا ہوا ہوتا ہے۔ پٹینی کہتا ہے کہ روم اور فارس کی دولت ان کی طرف ہی چلی جا رہی ہے، یہ اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم ہیں۔ اور ان کا سرینہ و شادان ملک باغات، کھیتوں اور عوامی سے بھرا ہوا ہے۔ آرٹن میڈوز کہتا ہے کہ یہ لوگ حبش میں مست ہو رہے ہیں اور جلانے کی لکڑی کے بجائے دار چینی، صندل اور دوسری خوشبودار لکڑیاں جلاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے یونانی مورخین روایت کرتے ہیں کہ ان کے علاقے کے قریب سے حل سے گزرتے ہوئے تجارتی جہازوں تک خوشبو کی لٹپٹیں پہنچتی ہیں۔ انہوں نے تاریخ میں پہلی مرتبہ صفا کے بلند پہاڑی مقام پر وہ فلک شگاف عمارت (SKYSCRAPER) تعمیر کی جو قصر محمدان کے نام سے صدیوں تک مشہور رہی ہے۔ عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ اس کی ۲۰ منزلیں تھیں اور ہر منزل ۳۶ فیٹ بلند تھی۔ یہ سب کچھ بس اسی وقت تک رہا جب تک اللہ کا فضل ان کے شامل حال رہا۔ آخر کار جب انہوں نے کفرانِ نعمت کی حد کر دی تو ربِ قدیر کی نظر عنایت ہمیشہ کے لیے ان سے پھر گئی اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔